ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

مستشرقین کا اسناد حدیث پر اعتراض ایک تنقیدی جائزہ

ORIENTALISTS HAVE DOCUMENTED A HADITH PROTESTING A CRITICAL CRITICISM

ڈاکٹر ابراہیم عبد الرحیم اسسٹنٹ پروفیسر بلتستان یونیورسٹی سکردو (ویزٹنگ فیکلٹی)

Abstract

The Science of Isnad Hadith is the distinguished knowledge in Islam is scinces which Allah Almighty has bestowed on the Ummah of Muhammad Arabi (S.A.W). Through this knowledge, Allah Almighty has preserved the hadith of the Prophet (S.A.W). Due to the essential relationship between Isnad and s ience of Hadith it has been a target of criticism by anti-Islamic elements and has raised suspicions about its initial use, and to try to show that the knowledge of Isnad is a product of second and third century so that hadiths can be considered unreliable. This short article seeks to address this skepticism of the Orientalists, and explained that the knowledge of Isnad has gone through three stages and has taken the existing form of Isnad in the book of Hadith: The arguments put forward by the Orientalists for their opinion are baseless and the Orientalists themselves are at odds over the origin of the Isnad.

Key words: Isnad, Hadith, Orientalists, Ibn e Sireen.

تعارف:

علم اسناد حدیث وہ امتیازی علم ہے، جس سے اللہ تعالی نے محمد عربی ﷺ کی امت کو نوازا۔ اور اسے رسول اللہ ﷺ تک وصول کی علمی سیڑھی بنا دی۔ اہل کتاب اس امتیازی خصوصیت سے بالکل محروم رہے؛ اور ان کے اور انبیاء بنی اسرائیل کے درمیان نا قابل عبور علمی اور تاریخی خلا پیدا ہوا۔ اس لیے ان کے بنیادی عقائد اور انبیاء کرام کے اقوال واعمال مشکوک اور نا قابل اعتبار ٹھہرے۔ اللہ تعالی نے "دین اسلام" کو قیام ساعت تک تحریف و تبدیلی سے بچانے کے لیے علم الإسناد کے ذریعے اہل اسلام پر احسان عظیم فرمایا۔ حتی کہ اس حقیقت کا اعتراف اسلام دشمن عناصر مستشرقین کو بھی بر ملا کرنا پڑا مشہور مستشرق م۔۔۔ار جي-ل-وٹ اپنی کتاب: Lecturesom Arabic Historians میں لکھتے ہیں:
"(1)

اسناد کا نظریہ بہت مشقت طلب ہے، کیونکہ سلسلہ اسناد کے ہر راوی کا ثقہ "یعنی قابل اعتبار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ موضوع حدیث گھڑ کر بیان کرنے کا رواج ہو چلا تھا۔ اور کبھی کبھی اس حوالے سے سستی دیکھی گئی تھی۔ لیکن باریک بینی سے تحقیق کے نتیجے میں - اسناد کی اہمیت میں - کوئی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور مسلمان اپنے فن حدیث پر فخر کرنے میں حق بجانب ہیں۔

محدثین سے پہلے جاہلی اشعار کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے کے لیے اسناد کا استعمال محدود دائرے میں شروع ہو چکا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال سیدنا عمر الفاروق نے ایک شعر پڑھا، پھر فرات بن زید اللیثی سے پوچھا: آپ کو معلوم ہے کہ یہ شعر کس کا ہے؟ فرات نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: یہ آپ کے بھائی اقسامہ بن زید اللیثی کا ہے۔ انہوں نے خود مجھے یہ شعر سنایا اور میں نے انہی سے یاد کیا ہے۔(2)

لیکن اسناد کا استعمال اتنا عام نہیں تھا، جتنا بعد میں حدیث نقل کرنے میں استعمال ہوا، اور "علم الاسناد" کو علم حدیث کے ذریعے ایک واضح پہچان ملی۔ اور دوسرے فنون والے محدثین کے اس طریقہ کار سے متاثر ہوئے۔ اور تفسیری روایات، تاریخی روایات اور ادبی فقرے ایک دوسرے تک پہنچانے میں اسناد کا استعمال شروع ہوا، لیکن اسنار کے استعمال میں ان کے ہاں وہ کڑی شرطیں نہیں تھیں، جو محدثین کے ہاں معروف تھیں۔

علم اسناد کے ساتھ علم حدیث کے لازمی تعلق کی وجہ سے اسلام دشمن عناصر نے اس کی طرف انگلی اٹھائی، علم اسناد کی شروعات کے بارے میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی، تاکہ یہ باور کرایا جائے کہ علم اسناد کی شروعات دوسری صدی میں ہوئی ہے، اس سے پہلے عرب اس علم سے نا آشنا تھے، لہذا نتیجہ یہی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ علم اسناد دوسری صدی کی پیداوار ہے، بنابریں حدیث کا ذخیرہ بھی مشکوک اور نا قابل اعتماد ہے۔

اس مختصر مقالے میں راقم ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرے گا کہ "علم اسناد" کی شروعات کب ہوئی؟ اور مستشرقین اس حوالے سے کیا شکوک پیش کرتے ہیں؟ ساتھ ہی ان کے شبہات کا علمی محاکمہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

مبحث اول: علم اسناد کی تعریف اور اس کی اہمیت:

لغت عرب میں "سند" تین معنوں میں آتا ہے **پہلا:** اعتماد، **دوسرا:** اوپر اٹھانا، بلند کرنا، **تیسرا:** حوالہ یعنی ریفرنس دینا.

بطور مثال: عرب جب کہتا ہے: "فلانٌ سَنَدٌ". یعنی فلان قابل اعتبار، معتمد آدمی ہے۔

اور سند اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے، جو زمین سے بلند وبالا ہو۔

اور اسناد مصدر ہے، فعل (أَسند يُسْنِدُ) کا۔ اور جب کوئی شخص کہتا ہے: "أسند الحدیث"۔ اس کا مفہوم ہوتا ہے کہ اس نے مقولہ کو اس کے قائل کا ریفرنس دیا۔(3)

محدثین کی اصطلاح میں "سند راویوں کے اس سلسلے کو کہا جاتا ہے، جو متن تک پہنچا دے۔(4)

علماء حدیث کے ہاں سند، إسناد دونوں مترادف ہیں۔ اس لیے ناقدین حدیث؛ حدیث پر حکم لگاتے ہوئے کہتے ہیں "سندٌ صحیحٌ" "إسنادٌ صحیحٌ" اور مقصود ایک ہی ہوتا ہے۔(5)

اسناد کی اہمیت اور افادیت:

علم حدیث میں اسناد کی بڑی اہمیت ہے، جو درج ذیل نقاط میں واضح کی جاسکتی ہے:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

1- علم حدیث کے ساتھ اس کا کلیدی تعلق ہے، گویا علم حدیث کا ایک جزوِلاینفک ہے، علم اسناد کی اہمیت علم حدیث کی اہمیت اور فضیلت سے کشیدہ ہے۔

2- اسناد وہ پل ہے، جس کے ذریعے قرآن اور حدیث ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا۔ قرآن اور سنت کو صحابہ رسول ﷺ نے نبی کریم ﷺ سے اور تابعین نے صحابہ اور تبع تابعین نے تابعین سے نقل کرتے ہوئے آخر تک پہنچایا۔

۳- اسناد اس امت کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حوالے سے فرماتے ہیں: علم الإسناد اور وعلم الروایۃ ان علوم میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالی نے امت محمد سے کے ساتھ خاص فرمایا۔ اور انہیں درایت (فرمودات مصطفوی) کی سیڑھی بنایا۔ اس کے برعکس یہود و نصاری کے ہاں اسناد کا کوئی تصور نہیں، جن کے ذریعے ان کے منقولات شیئر ہوئے ہوں۔[6]

4- اللہ تعالی کا اس امت کے لیے اسناد کی حفاظت کرنا اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتا ہے۔ زاہد عالم دین عبد اللہ بن المبارک کا ارشاد ہے: « إنّ اللہَ حَفِظَ الأسانیدَ علی أمّۃِ محمدٍ ﷺ »۔[7]

5- علم اسناد کی معرفت فرض کفایہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: اسناد کے ذریعے ہی موضوع حدیث صحیح حدیث سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی معرفت اور جانکاری فرض کفایہ ہے۔[8]

6- اسنا حدیث وہ محور ہے، جس پر نقد حدیث کے بہت سے قاعدوں اور ضابطوں کا دارومدار ہے۔

7- علم اسناد کی اہمیت، اس کی منزلت اور اس کی افادیت کے حوالے سے ائمہ محدثین سے بہت سارے نصوص وارشادات منقول ہیں:

ا- میدان زہد کے شہسوار امام عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں: (الإس-ن-اد م-ن ال-دي-ن، ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء)[9] اسناد دین کا حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہوتے تو جس کے دل میں جو آتا کہہ دیتا۔

ب- انہی سے منقول ہے: (بيننا وبين القوم القوائم يعني الإسناد)[10] ہمارے (محدثین) اور دوسرے لوگوں کے درمیان قابل اعتبار چیز اسناد ہے۔

علم اسناد کے فائدے

علم اسناد ملحدین بدعتیوں جھوٹوں اور سنت رسول ﷺ کے خلاف سازش کرنے والوں کے سر پر کلہاڑے کی مانند ہے۔ اگر علم اسناد کے فوائد میں سے صرف یہی فائدہ ہوتا تو کافی تھا۔ لیکن اس کے متعدد فوائد اور دور رس نتائج ہیں، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کر دیتا ہوں۔

1- محدثین اس اسناد کے ذریعے صحیح اور غیر صحیح احادیث کی پہچان کرتے ہیں صحت اور ضعف کی پہچان کی یہی ایک کسوٹی ہے، علم نقد حدیث کا عظیم ناقد شعبہ بن الحجاج العتکی کا کہنا ہے: (إنما یُعلم صحۃُ الحدیث بصحۃِ الإسناد)[11]، صحیح حدیث کی پہچان سند صحیح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اور یحیی بن سعید القطان (ت:۱۹۸) فرماتے ہیں: (لات-ن-ظ-روا إلی الحدیث، ولکن انظروا إلی الإسناد، فإن صح الإسناد، وإلا فلا تغتر بالحدیث إذا لم یصح الإسناد)[12].

2- اسی اسناد کے ذریعے محدثین کرام نے دین کی حفاظت کی۔ دین میں مبتدعین کی بدعات کو داخل ہونے سے بچایا۔ ہر کس وناکس کی نبی کریم ﷺ کی طرف نسبت کر کے باتیں بنانے کا دروازہ بند کر دیا۔ اگر کوئی بھی شخص حدیث بیان کرتا تو فورا اس سے پوچھا جاتا: (سموا النار جالکم). " اس حدیث کے راوی بیان کرو، تاکہ معتبر راویوں سے حدیث لی جائے اور غیر معتبر راویوں کی حدیث ٹھکرا دی جائے۔

3- علم اسناد کے ذریعے ہی حدیث کے مخرج اور مصدر کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔ کیا حدیث بیان کرنے والے ثقہ یعنی قابل اعتبار ہیں یا نا قابل اعتبار مجروح اور ضعیف۔ اور مخرج حدیث حجاز ہے، یا شام یا عراق یا کوئی اور جگہ؟ جب کسی حدیث کو بیان کرنے والا شامی ہو، پھر اس سے روایت کرنے والا عراقی ہو، اور ان سے نقل کرنے والے حجازی، پھر ان سے روایت کرنے والا پھر شامی ہو تو نقاد حدیث اس کی صحت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

4- علم اسناد کے ذریعے راویوں کے اوہام اور حدیث میں ان سے واقع ہونے والی غلطیوں کی پہچان ہوتی ہے۔ حدیث کی اسناد میں واقع ہونے والی کمزوریوں (علل) کو پہچانے کا واحد ذریعہ اس حدیثے کی ساری اسانید کو یکجا کرنا اور ان کے درمیان موازنہ کرنا ہے۔ علم علل حدیث کے عظیم ماہر علی بن عبد اللہ المدینی کا کہنا ہے: (الباب إذا لم تجمع طرقہ لم یتبین خطؤہ)[13]

5- محدثین سے متاثر ہو کر دیگر فنون والوں نے بھی اپنے فن کے علم کو نقل کرنے کے لیے اسناد کا استعمال کیا، جن میں علم التفسیر؛ علم اللغہ؛ علم ادب؛ اور اشعار وغیر مشہور ہیں لیکن علم اسناد کو جس قدر اہتمام علم حدیث میں حاصل ہوا، اس کے قریب تک کسی دوسرے علم کی رسائی نہ ہو سکی۔

6- محدثین کرام کی اسناد کے اہتمام پر اس سے منسلک کئی اور علوم وجود میں آئے جن میں علم رواۃ الحدیث، علم الجرح والتعدیل، علم اصول الحدیث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مبحث ثاني: علم الاسناد کی ابتداء اور تطور کے مراحل

عہد رسالت مآب ﷺ میں صحابہ کرام کو اسناد استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور وہ حدیث نقل کرنے والے کا نام نہیں پوچھتے تھے، کیونکہ اس وقت وہ حدیث نبوی ڈائریکٹ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے لیتے تھے۔ اور زمانہ بھی مثالی سچائی، امانت داری، دیانت داری اور اعتبار واعتماد کا تھا۔ کوئی ایک دوسرے پر کسی قسم کے جھوٹ یا خیانت کا الزام نہیں لگاتا تھا۔ جھوٹ ان کے ہاں بدترین صفت شمار ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ بیان کرتی ہیں: « ما کان خلق أبغض إلی أصحاب رسول اللہ ﷺ من الکذب، ولقد کان الرجل یکذب عند رسول اللہ ρ الکذبۃ فما یزال في نفسہ علیہ، حتی یعلم أنہ قد أحدث منہا توبۃ »[14].

ایک دوسرے پر اعتماد کی فضا قائم تھی، جھوٹ بولنے کا رواج سرے سے نہیں تھا۔ لہذا جب کوئی صحابی دوسرے صحابی کی وساطت سے اللہ کے نبی ﷺ سے حدیث نقل فرماتا، تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس نے گویا نبی کریم ﷺ سے ہی حدیث بیان کی ہے۔ صغار صحابہ یا دیر سے اسلام قبول کرنے والے یا دیر سے ہجرت کرنے والے صحابہ کبھی کبھی نبی

کریم ﷺ سے متعلق ایسا واقعہ بیان کرتے، جن میں وہ عینی شاہد نہیں تھے، بلکہ ان صحابہ سے سن چکے ہوتے جنہوں نے بنفس نفیس اس میں شرکت فرمائی ہو۔ علم مغازی رسول ﷺ کے ماہر انصاری صحابی البراء بن عازب فرماتے ہیں: « م-اک-ل ما نحدثکم عن رسول اللہ سمعناہ منہ، منہ ماسمعنامنہ، ومنہ ماحدثناعنہ أصحابہ، ونحن لانکذب »[15]. « وكانت لنا ضيعةٌ وأشغالٌ ولكن الناس لم يكونوا يكذبون يومئذ فيحدث الشاهد الغائب »[16]. جو حدیث ہم تمہیں بیان کرتے ہیں، ان میں سے ہر حدیث ہم نے اللہ کے نبی ﷺ سے نہیں سنی ہے۔ ان میں سے بعض ہم نے خود سنی ہے، اور دوسرے بعض دیگر صحابہ کرام نے سن کر ہمیں بیان فرمایا ہے، اور ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ایک روایت میں ہے مدینہ میں ہماری جائیدادیں اور دوسری مصروفیات بھی ہوتی تھیں، اور اس زمانے میں لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے، اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتا وہ غیر حاضر لوگوں کو بیان کرتا تھا۔'

سیدنا ابو سعید الخدری کے شاگرد رشید أبو الوداک جبیر بن نوف نے ایک دن ان سے عرض کیا: مجھے ایک ایسی حدیث بیان کیجئے جو آپ نے بذات خود رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو، اس کے علاوہ بیان نہ کیجے۔ ابو سعید نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کئی ایک اپنی کھیتی باڑی میں مصروف ہوتے، اس سے فارغ ہونے کے بعد نبی ﷺ کے پاس تشریف لاتے، اگر نبی کریم ﷺ سے ملاقات نہ ہو سکے تو دوسرے حاضرین مجلس صحابہ سے عرض کرتے: جو کچھ آپ لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنی ہیں وہ ہمیں بیان کریں، اور ہم میں سے کئی ایک کی کھیتی باڑی نہیں ہوتی تھی، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے تھے۔[17]

خادم رسول حضرت انس بن مالک ؓ نے ایک دن حدیث بیان فرمائی۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا: کیا یہ حدیث آپ نے بذات خود اللہ کے نبی ﷺ سے سنی ہے؟ ''سیدنا انس نے اس سوال پر سیخ پا ہو کر فرمایا: « واللہ م-اک-ل م-انح-دثکم بہ سمعناہ من رسول اللہ ﷺ ولكن كان ي-ح-دث بعضنا بعضا ولا يتّهم بعضُنا بعضًا »[18] ''اللہ کی قسم! وہ احادیث جو ہم تمہیں بیان کرتے ہیں، ان میں سے ہر حدیث ہم نے اللہ کے نبی ﷺ سے ڈائریکٹ نہیں سنی ہے، لیکن ہم صحابہ ایک دوسرے کو نبی کریم ﷺ کی احادیث سنایا کرتے تھے، اور کوئی ایک دوسرے پر (جھوٹ کا) الزام نہیں لگا تا تھا۔ اور بعض روایات میں آتا ہے: « والله ما كنا نكذب ولا ندري ما الكذب »[19] اللہ کی قسم ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے، بلکہ ہم جانتے ہی نہ تھے کہ جھوٹ کیا چیز ہے!!!

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے عرف میں جب کوئی صحابی یہ فرمائے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا'' تو ممکن تھا کہ اس نے بذات خود نبی ﷺ کی زبان مبارک سے سنی ہو، اور یہ بھی ممکن تھا کہ دوسرے صحابی کی وساطت سے سنی ہو، کیونکہ وہ لوگ اللہ کے نبی ﷺ ڈائریکٹ حدیث سنتے تھے اور کبھی دوسرے صحابی کی وساطت سے سنتے تھے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے زمانے میں اسناد کے استعمال کی ضرورت نہ ہونے، اور واسطوں کا ذکر نہ ذکرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سرے سے ہی واسطوں کا تذکرہ نہ کرتے تھے، بلکہ کئی ایک واقعات میں صحابہ کرام ان واسطوں کا تذکرہ بھی فرماتے، جن کے ذریعے انہیں حدیث پہنچی تھی۔ اور بعض دفعہ حدیث سننے والا باقاعدہ اس حدیث پر گواہی طلب کرتا، اور بعض دفعہ قسم دلا تا تھا۔ یہ علم اسناد کی پہلی سیڑھی اور اسناد حدیث کی ابتدا کہلا سکتی ہے۔ یہی علم الاسناد کا سنگ بنیاد ہے۔ امام ذہبی نے اسے "التثبت في النقل، یعنی نقل روایت میں چھان بین اور احتیاط سے تعبیر کیا ہے۔[20]

اس کی واضح مثال قبي-ص-ة ب-ن ذؤیب بیان کرتے ہیں سیدنا حضرت ابو بکر صدیق کے پاس ایک دادی آئی اور اپنے فوت شدہ پوتے سے اپنا وراثت کا مطالبہ کیا۔ سیدنا ابو بکر صدیق نے کہا: کتاب اللہ میں دادی کی وراثت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، اور سنت رسول اللہ ﷺ میں مجھے آپ کے حصے کا کوئی علم نہیں ہے۔ آپ واپس جائیں تاکہ میں لوگوں سے اس بابت دریافت کروں، پھر لوگوں سے یہ مسئلہ پوچھ لیا۔ مغیرۃ بن شعبہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ عطا فرمایا ہے۔'' آپ نے پوچھا: کیا آپ کے علاوہ کوئی اور بھی اس موقع پر موجود تھا؟ تو محمد بن مسلمہ کھڑے ہو گئے اور اس کی تائید کر دی۔ اب حضرت ابو بکر صدیق نے وادی کو چھنا حصہ دلایا۔[21]

حضرت ابو سعید الخذری کا بیان ہے، ایک دن میں انصاریوں کی مجلس میں بیٹھا تھا اتنے میں حضرت ابو موسی اشعری سہمے سے ہوئے آئے اور عرض کیا۔ میں نے عمر فاروق کے گھر پر تین مرتبہ دستک دی، مجھے جواب نہیں ملا تو واپس آیا۔ پھر انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا: کیوں واپس گئے؟ میں نے عرض کیا: میں نے تین دفعہ اجازت طلب کی مجھے اجازت نہیں ملی تو واپس آ گیا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم کسی کے گھر جائیں تو تین مرتبہ اجازت طلب کرو، اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔'' یہ حدبیث سن کر حضرت عمر نے مجھ سے کہا: اللہ کی قسم! تجھے اس حدیث پر گواہ پیش کرنا پڑے گا۔'' کیا آپ میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے؟ حضرت ابی بن کعب نے کہا: آپ کے حق میں گواہی دینے کے لیے اس مجلس کا سب سے کم عمر آدمی کھڑا ہو گا۔ ابو سعید الخذری کہتے ہیں: اس مجلس کا سب سے کم تر نفس میں تھا، میں ان کے ساتھ چلا گیا اور حضرت عمر فاروق کو یہ حدیث سنادی۔[22]

امام مالک کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے اس سختی پر صفائی پیش کرتے ہوئے فرمایا: « أم-ا إن-ي ل-م اتهمك، ولكني خشيت أن يقول الناس على رسول الله ﷺ » ابو موسی! سنو مجھے آپ پر کسی جھوٹ کا اندیشہ نہیں تھا، جس کی بنا پر میں نے کوئی الزام دھرا ہو لیکن مجھے خوف ہوا کہ آنے والے وقتوں میں لوگ اللہ کے نبی ﷺ کی طرف باتیں گھڑ کر منسوب کریں گئے۔

حدیث نبوی کی روایت میں احتیاط کا تیسرا واقعہ؛ چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب ؓ سے منقول ہے۔ تابعی قلیل أس-م-اء اب-ن الحکم الفزاري حضرت علی سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جب میں کوئی حدیث اللہ کے رسول ﷺ سے سنتا تو اللہ تعالی مجھے جتنا فائدہ پہنچانا چاہتے اتنا فائدہ مجھے حاصل ہو جاتا۔ اور جب آپ کے صحابہ میں سے کوئی مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث بیان کرتا تو میں انہیں قسم دلاتا، جب وہ قسم کھاتے تو میں اس کی تصدیق کرتا اور حدیث مجھے حضرت ابو بکر صدیق نے بیان فرمائی اور ابو بکر نے سچ فرمایا۔[23]

سیدنا علی بن ابی طالب ؓ نے حضرت ابو بکر ؓ کو قسم نہیں دلائی، کیونکہ حضرت علی کو یقین محکم تھا کہ ابو بکر جو بولے گ سچ ہی بولے گا۔ ابو بکر باقلانی اس حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں: سیدنا علی ان صحابہ کرام کو قسم دلاتے، جن کی صحبت نبی ﷺ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھی۔ اور ان سے قسم لیتے تھے، جو حدیث کو یاد کرنے میں وہ اہتمام نہیں کرتے

تھے جو دوسرے صحابہ کرام کرتے تھے، اور جن سے غلطی ہونے کا امکان یا اندیشہ پایا جاتا تھا۔

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث نقل کرنے میں چھان پھٹک، قبول کرنے میں احتیاط کبار صحابہ کے دور میں بھی موجود تھا۔ لیکن یہ عام نہیں۔ گنے چنے بعض حالات میں گواہی طلب کی جاتی، یا قسم دلائی جاتی. لیکن عام روش نہیں تھی۔ جب کبار صحابہ کا دور ختم ہوا، اسلامی ریاست کے اندر فتوں نے سر اٹھانا شروع کیا، ناحق خون ہونے لگے، محمد رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ چنیدہ لوگوں میں سے اکثر و بیشتر دنیا سے رحلت فرما گئے، مصر، شام اور فارس کے نئے نئے مسلمانوں کی قوت اسلامی ریاست کے اندر بڑھتی گئی، ان کی ناپائیدار رائے اور فتنوں کا دباو اور یا ستی امور میں بڑھتا گیا، اصحاب رسول ﷺ پر ان کی طرف سے اقرباء پروری، ناانصافی کا الزام لگانا شروع کیا، تو محدثین کرام اسناد کے حوالے سے سختی کا ایک اور قدم آگے بڑھانے پر مجبو ہو گئے۔

اسناد حدیث کے حوالے سے تاکیدی سوال اور رواۃ حدیث کی چھان بین:

اس مرحلے کا آغاز سیدنا عثمان کی شہادت سے ہوتا ہے۔ جب سیدنا عثمان کو حرمت والے ماہ ذوالحجہ میں پیارے رسول ﷺ کے پیارے شہر میں ظلما شہید کر دیا گیا۔ اسلام کا نام لے کر آپس میں دست و گریبان ہوئے، مختلف قسم کے عقائد و نظریات نے جنم لیا۔ متشددانہ تعصب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اپنے باطل نظریات کی تقویت کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کا سہارا لینے گے تب اہل علم نے اسناد کے حوالے سے سوال کرنا شروع کیا۔ ان کے راویوں کی دیانتداری تولی جانے کی۔ اس بارے میں جلیل القدر تابعی محمد بن سیرین کا بقول بہت مشہور ہے: «**لم يكونوا يسألون عن الإسناد، فلما وقعت الفتنة قالوا: سموا لنا رجالكم، فينظر إلى أهل السنة فيؤخذ حديثهم، وينظر إلى أهل البدع فلا يؤخذ حديثهم**». [24]

پہلے وقتوں میں سند کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا، جب فتنہ واقع ہو گیا تو ائمہ حدیث راویوں سے کہنے لگے اپنے اساتذہ کا نام بتاؤ، چھان پھٹک کے بعد اہل سنت راویوں کی روایت قبول کی جاتی، اور بدعتیوں کی روایت رد کی جاتی۔ اس اثر میں دو باتیں واضح ہیں:

پہلی بات: فتنہ واقع ہونے کے بعد سند کے راویوں کے حوالے سے سوال کا آغاز ہوا۔

دوسری بات: ان فتنوں کے بعد مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ایک اہل سنت، جن کی روایت قابل اعتبار اور مقبول ہوتی، اور دوسری اہل بدعت جن کی روایت نا قابل اعتبار ہوتی، وہ ٹھکرا دی جاتی تھی۔ اب یہ بات قابل تحقیق ہے کہ ابن سیرین نے اس اثر میں کون سا فتنہ مراد لیا ہے؟ کیونکہ ابن سیرین ہی کی زندگی میں اسلامی ریاست کے اندر کئی فتنے واقع ہوئے، کئی خونریز جنگیں ہوئیں، خلفاء راشدین میں سے دو کو ظلما شہید کیا گیا۔

صحیح مسلم کے شارح امام قرطبی اس فتنے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سیدنا عثمان کے قاتلین اور خوارج قطعی طور پر فاسق تھے جب ان کی روایات دوسرے لوگوں کی روایات - جوان میں سے نہیں تھے۔ آپس میں مل گئیں، تب روایت کی چھان بین کی ضرورت پیش آئی تاکہ قاتلین عثمان اور خوارج کی روایت کو رد کر دیا جائے اور اہل سنت کی روایات کو قبول کیا جائے۔ اور یہی پیمانہ دوسرے بدعتیوں کی روایات میں بھی ملحوظ رکھا جائے۔ اور کوئی باشعور آدمی اس فتنے کو سیدنا علی، عائشہ اورامیر معاویہ کے درمیان ہونے والے فتنوں پر چسپاں نہ کرے، کیونکہ ان میں سے کوئی بدعتی تھا نہ فاسق۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک مجتہد تھا، اور ہر ایک نے اپنی صوابدید کے مطابق عمل کیا۔ اور مسلمانوں کے متفقہ اصول کے مطابق ہر مجتہد اجر کا مستحق ہے، ان میں سے کوئی اجتہاد کی بنیاد پر گناہ کا مستحق نہیں"۔ [25]

اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سیدنا عثمان کی شہادت تک کوئی بدعت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ جب ان کو شہید کیا گیا تو لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور دو متضاد بدعتیں وجود میں آئیں:

پہلی خوارج کی بدعت، جو سیدنا علی اور امیر معاویہ دونوں کو نعوذ باللہ کافر سمجھتے تھے، اور دوسری رافضیوں کی بدعت جو سیدنا علی کی امامت، عصمت، نبوت حتی کہ الوہیت کے قائل تھے۔ [26]

اس فتنے کے واقع ہونے کے بعد محدثین اسناد کے بارے میں سوال کرنے، حدیث کے راویوں کے حالات زندگی کے بارے میں پوچھنے کی ضروری پڑی؛ کیونکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ ہر گروہ اپنی رائے کی تقویت کے لیے نبی کریم ﷺ پر حدیث گھڑے، نصوص میں تحریف کرے، احادیث کے اندر کمی بیشی کرے، لیکن اس مرحلے میں بھی اسناد کا التزام ہر راوی نہیں کیا کرتا تھا۔ اور نہ ہر شہر میں اس کی پابندی کی گئی۔ کیونکہ اس زمانے کے بہت سارے محدثین حدیث کو مرسلا - یعنی ڈائریکٹ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے تھے - اس کی مثال اس اثر سے ملتی ہے کہ ایک شخص نے تابعی جلیل حسن بصری سے عرض کیا آپ ہمیں ڈائریکٹ اللہ کے رسول ﷺ سے احادیث بیان کرتے ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اس شخص کا حوالہ دیتے جس نے یہ حدیث آپ کو اللہ کے نبی ﷺ سے بیان کی ہے۔ حسن بصری نے فرمایا: اللہ کی قسم نہ ہم نے جھوٹ بولا، اور نہ ہم سے جھوٹ بولا گیا۔ میں خراسان کی جنگ میں شریک تھا، اور ہمارے ساتھ تین سو صحابی رسول ﷺ شریک تھے۔ [27]

اس دور میں بہت سارے تابعین ان اصحاب رسول ﷺ کا حوالہ دیتے، جن کی وساطت سے انہیں حدیث پہنچی، اور کئی تابعین عظام حوالہ دینے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان صحابہ کرام نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ صحابہ کرام کو معلوم نہیں تھا کہ جھوٹ کیا چیز ہے؟! لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا زمانہ اللہ کے نبی ﷺ کے زمانے سے دور ہوتا گیا، ایک آدھ واقعہ ایسا بھی ہوا کہ جس میں نبی کریم ﷺ پر جھوٹ گھڑا گیا۔ تو محدثین نے اسناد کے حوالے سے سخت ترین قدم اٹھالیا اور کوئی بھی حدیث اسناد کے بغیر قبول کرنے سے گریز کیا۔ اس مرحلے کو اسناد کی پابندی کا مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ اسناد کی پابندی اور التزام:

جب دروغ گوی عام ہونے لگی، موضوع احادیث ظاہر ہونے لگیں، عراق کے اندر سنہ ساٹھ ہجری کے آس پاس نبی کریم ﷺ اور سیدنا علی کی طرف منسوب کر کے احادیث گھڑی گئیں، تو محدثین نے اسانید کی پابندی کی، اور دوسروں کو بھی حوالے کی پابندی پر مجبور کیا۔ اور ان راویوں کی حدیث کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے تھے جو بغیر حوالے کے حدیث بیان کرتے۔ اور بغیر اسناد کے حدیث بیان کرنے والوں کی حوصلہ شکنی بھی کرتے تھے۔ عتبہ بن ابی الحکم بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں اسحاق بن ابی فروہ کے

پاس بیٹھا تھا، ان کے پہلو میں امام زہریؒ جلوہ افروز تھے۔ اسحاق بن ابی فروہ کہتا گیا: قال رسول اللہ ﷺ، قال رسول اللہ ﷺ امام زہری نے اسحاق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اے ابن ابی فروہ! اللہ تجھے غارت کرے، تو اللہ پر کتنی جسارت کر رہے ہو، اپنی احادیث کا حوالہ ہی نہیں دیتے ہو۔ اور ایسی ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی نکیل ہے اور نہ لگام۔[28]

ولید بن مسلم شامی کہتے ہیں: ابن شہاب زہریؒ کی اس تنبیہ کے بعد ہمارے ساتھیوں نے احادیث کی اسانید کی پابندی اختیار کر لی۔[29]

عراق کے مشہور عالم دین اکرم ضیاء العمریؒ فرماتے ہیں: "اسانید کی پابندی اور اسانید کے ساتھ حدیث بیان کرنے پر اصرار صحابہ کرام اور کبار تابعین کے بعد حدیث گھڑنے کے واقعات رونما ہونے کے بعد زیادہ ہوا، اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حدیث گھڑنے کا رواج بھی بڑھتا گیا۔ اس وقت سے محدث کے لیے حدیث بیان کرتے ہوئے اسناد حدیث کا بھی ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ روایت کی قبولیت کے لیے اسناد کا ذکر اولین شرط ٹھہرا۔ حتی کہ صغار تابعین میں سے ابن شہاب الزہریؒ نے اسناد سے غفلت برتنے کو اللہ تعالیٰ پر جرأت مندی اور بڑی جسارت سے تعبیر کیا۔[30]

آغازِ اسناد اور اس میں ترقی کو ہم درج ذیل تین مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- **روایت کی تصدیق اور احادیث کو قبول کرنے میں احتیاط** کبار صحابہ کے دور میں شروع ہوا۔ جس طرح حضرت ابو بکر صدیق نے دادی کی وراثت، عمر فاروق نے حضرت ابو موسی الاشعری سے گواہ طلب کرنا، اور حضرت علی کا حدیث بیان کرنے والے سے قسم دلانے کے واقعات سے ظاہر ہوتے ہیں۔

لیکن ہر صحابی اس کی پابندی نہیں کرتا تھا، بلکہ بعض حالات کے پیش نظر صحابہ کرام محتاط طریقہ اختیار کرتے تھے۔

۲- **اسناد بیان کرنے کی تاکید**: یہ مرحلہ حضرت عثمان غنی کی مظلومانہ شہادت کے بعد اسلامی ریاست کے اندر پیش آنے والے دردناک واقعات کے رونما ہونے کے بعد شروع ہوا۔ جس طرح امام ابن سیرینؒ نے اس کی وضاحت کی۔ اور اسناد بیان کرنے کی تاکید کا بنیادی سبب فتنوں کا سر اٹھانا اور خون ریزی سے پیدا ہونے والے اثرات اور ان فتنوں کے بعد حدیث نبوی میں جھوٹ بولنے کا خدشہ اور امکان تھا۔ اس مرحلے میں اسانید کا ذکر پہلے مرحلے کی نسبت زیادہ ہوا۔ پھر بھی ہر راوی اس کی پابندی نہیں کرتا تھا، اور نہ ہر شہر میں اس کی لازمی اور ضروری سمجھا جاتا تھا۔

۳- حدیث کے ساتھ اسانید اور حوالوں کی پابندی:

یہ علم الاسناد کی ترقی کا آخری مرحلہ اور نقطہ اختتام ہے۔ جس کا آغاز حدیث نبوی میں جھوٹ ملانے، اور گھڑی ہوئی باتیں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب کرنے کے بعد ہوئی۔ اور محدثین کا اسناد کی پابندی اور التزام کی بنیادی وجہ احادیث رسول ﷺ کو جھوٹی روایات سے محفوظ کرنا تھا۔ اس میں محدثین کو اللہ کے فضل سے 100٪ کامیابی حاصل ہوئی۔ اور بعد میں اسانید مسلمانوں کا طرہ امتیاز بن گئی۔ مسلمان اس امتیازی شان پر جتنا فخر کریں کم ہے اور ادیان عالم پر اپنی برتری جتانے میں حق بجانب ہیں۔

مبحث ثالث: وہ فتنہ جس کے بعد علم الاسناد کی ابتدا ہوئی

یہاں اس فتنے کی تعیین اس لیے ضروری ہے کہ مستشرقین اس فتنے کی تشریح اپنے من کے مطابق کرنے کے بعد اسنادِ حدیث کا آغاز بہت بعد میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ حدیث کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دیا جائے۔

ذیل میں ائمہ اسلام اور محدثین عظام کے اقوال کی روشنی میں اس فتنے کی نشاندہی کرنے کے بعد مستشرقین کی من پسند تفسیر اور اس کا علمی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

خود امام ابن سیرینؒ سے کئی اقوال منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فتنہ سیدنا عثمان بن عفان کی شہادت اور اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے فتنے ہیں، جنہوں نے اسلامی تاریخ میں بہت سے منفی اثرات چھوڑے اور اہل اسلام کو دو نہ ختم ہونے والے گروہوں میں بانٹ دیا۔

۱- ابن سیرینؒ کہتے ہیں: "فتنہ بھڑک اٹھا، جبکہ صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ اس فتنے میں ایک سو صحابہ بھی شریک نہیں ہوئے، بلکہ تیس کی شرکت بھی یقینی طور پر معلوم نہیں"۔[31]

۲- ابن سیرینؒ سے منقول ہے: "جب بلوائی سیدنا عثمان کے دروازے پر جمع ہو گئے تو کسی نے مشورہ دیا: امیر المؤمنین! آپ اپنے محافظ دستے لے کر نکلیں، شاید وہ انہیں دیکھ کر واپس چلے جائیں۔ تو سیدنا عثمان اپنا دستہ لے کر نکلا تو بلوائیوں میں سے ایک نے تلوار نیام سے نکالی اور عثمان کے دستے میں سے ایک نے اپنی تلوار سونت لی۔ وہ دونوں آپس میں مد بھیڑ ہو گئے۔ سیدنا عثمان نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا: "میری حکومت میں میری زیر امارت مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں؟" یہ کہہ کر گھر میں داخل ہو گئے اور شہادت تک وہیں محصور رہے"[32]۔

۳- ابن سیرینؒ سے منقول ہے: "وقعت الفتنۃ حین وقعت وأصحابُ رسول اللہ ﷺ لعشرۃ آلافٍ أو أکثرُ، فلو أذنَ لھم لضربوھم حتی یخرجوھم من أقطار المدینۃ"[33]۔

جب فتنہ برپا ہوا تو صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار یا اس سے زیادہ تھی، اگر حضرت عثمان اجازت دیتے تو ان بلوائیوں کو مار مار کر مدینہ کے کونے کونے سے بھگا دیتے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوئی کہ ابن سیرینؒ کے بیان میں فتنے سے مراد شہادت عثمان ہی تھا۔ اس فتنے کی وضاحت: ابن سیرین کے ہم عصر جلیل القدر تابعی حسن بن ابی الحسن البصریؒ کی اس آیت کی تفسیر سے ہوتی ہے ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُم مَّیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ﴾[34] حسن بصری فرماتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگ کہنے لگے: وہ کون سا جھگڑا ہے جو ہمارے درمیان پایا جاتا ہے؟ ہم آپس میں الفت، محبت اور بھائی چارگی سے رہتے ہیں؟ جب سیدنا عثمان کی شہادت کے بعد فتنہ واقع ہوا تو لوگوں کے نظریات مختلف ہو گئے، مختلف فرقوں میں لوگ بٹ گئے، ایک دوسرے کو قتل وغارت کی چکی میں پیسنے لگے، تب لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ خصومت سے کیا مراد ہے۔

مفسر قرآن امام قرطبیؒ ابن سیرینؒ کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس فتنے سے مراد - واللہ أعلم - شہادت عثمان غنی کا فتنہ اور سیدنا علی اور امیر معاویہ پر خوارج کی بغاوت کا فتنہ ہے، کیونکہ خارجیوں نے سیدنا علی اور معاویہ کو کافر اور مسلمانوں کے خون اور مال کو حلال قرار دیا تھا"۔[35]

شیخ الإسلام امام ابن تیمیہؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب منہاج السنۃ النبویۃ میں صحیح مسلم کی حدیث نقل کرتے ہیں: عن حذیفۃ قال: « قلت یا رسولَ اللہ ﷺ إنا کنا في جاھلیۃٍ وشرّ،

فجاءنا اللہ بھذا الخیر، فھل بعد ھذا الخیر من شر؟» میں نے عرض کیا؛ اے اللہ کے رسول! ہم جاہلیت اور برائیوں میں گھرے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ بھلائیاں لائیں، کیا اس بھلائی کے بعد اور بھی فتنے اور شر آئیں گے؟ امام ابن تیمیہؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس شر اور برائی سے مراد سیدنا عثمان کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والے فتنے ہیں، اور ان کی شہادت کے بعد لوگ فرقوں میں بٹ گئے..... اور سیدنا حذیفہ نے یہ حدیث فتنوں کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے حضرت عمر اور عثمان کے دور خلافت میں بیان فرمایا تھا، اور جب حضرت حذیفہ کو شہادت عثمان کی خبر ملی تو انہوں نے یقین کر لیا کہ جس فتنے کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا، وہ واقع ہو چکا ہے۔[36]

ان علماء کرام کی تصریحات اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ محمد بن سیرینؒ نے جس فتنے کو حدیث کے حوالے ذکر کرنے کا نقطہ آغاز قرار دیا تھا، وہ شہادتِ عثمان غنی کے بعد اٹھنے والی خانہ جنگیاں اور خون ریزیاں ہیں، جن سے مسلمان دو واضح گروہوں میں بٹ گئے، اور اس کا خمیازہ آج تک مسلمان امت بھگت رہی ہے۔ اور یہ فتنوں کا وہ دروازہ تھا، جسے توڑ دیا گیا اور آج تک اسے بند نہیں کیا جا سکا۔

مبحث رابع: مستشرقین کے ہاں اس فتنہ کی تفسیر:

مستشرقین بزعم خود یہ کوشش کرتے ہیں کہ حدیث نبوی کے لیے اسانید کا استعمال بعد میں ہوا ہے۔ اور اس نظریے کی تائید کے لیے امام ابن سیرینؒ کے اس اثر کا سہارا لیتے ہیں۔ اور جس فتنے کو ابن سیرین نے اسناد کے بیان کے لیے حد فاصل قرار دیا تھا، اس کی تفسیر دوسری صدی میں پیش آنے والے بعض حوادث اور واقعات سے کرتے ہیں، جن سے ان کے نظریے کو تقویت ملے۔ لیکن مستشرقین کی جماعت اس فتنے کی تفسیر میں یک زبان نہیں، بلکہ جس کسی کو جہاں سے تنکا ملا ڈوبتے نے اسی کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

ان میں سب سے پہلا نام جوزیف شاخت Joseph Schacht کا آتا ہے، وہ اس فتنے کی تشریح یوں کرتا ہے: تابعی ابن سیرین سے منقول ہے کہ اسناد کے بارے میں استفسار اور سوال فتنہ واقع ہونے کے بعد ہوا، کیونکہ جب تک راویوں کے بارے میں چھان بین نہ کی جائے، اس وقت تک کسی کو ثقہ (قابل اعتبار) ماننا ممکن نہ تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فتنہ 126ھ میں ولید بن یزید کے قتل اور بنی امیہ کی حکومت کے اختتام کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہاں تک وہ خوبصورت اور پرانے ایام تھے، جن میں نبی کریم ﷺ کی سنت غالب تھی۔ چونکہ ابن سیرین کی وفات 110ھ میں ہوئی ہے، اس لیے ہم اس اثر کی نسبت ان کی طرف درست نہیں سمجھتے، پس یہ من گھڑت ہے۔ بہر حال کوئی ایسی دلیل نہیں، جس کی بنیاد پر ہم اس بات کو قبول کریں کہ اسناد کا وجود دوسری صدی ہجری سے پایا جاتا ہے"۔[37]

جوزیف شاخت جانتا تھا کہ ولید بن یزید کے قتل سے پہلے بھی کئی ایسے فتنے واقع ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی، لیکن شاخت اگر فتنے کی تفسیر پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں واقع ہونے والے فتنوں سے کرتا، تو اس نظریے کی تائید نہ ہوتی جو اس نے قائم کر رکھا تھا جس کسی کو بھی تاریخ اسلامی کے ابجدیات کا پتہ ہو وہ جانتا ہے کہ (سنہ 126 ہجری) تاریخ اسلامی میں کوئی نقطہ تبدیلی نہیں. تاریخ اسلامی میں سب سے سنہرا دور خلفاء راشدین کا زمانہ ہے، نہ کہ اس کے بعد والے ادوار جن کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ (سنہ 126 ہجری) سنہرے دور کا نقطہ اختتام ہے.

لہذا اپنے نظریے کی تائید کے لئے تاریخ طبری کی ایک روایت کا سہارا لیا، جس میں اس تاریخ کو فتنے کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے. امام طبری رحمہ اللہ (سنہ 126 ہجری) کے حوادث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (وفي ھذہ السنۃ اضطرب حبل بني مروان، وھاجت الفتنۃ)[38].

اس سال بنی مروان کی طاقت کی رسی ہلنے لگی، اور فتنے بھڑک اٹھے.

سنہ 126 ہجری کے حادثات پر فتنہ کا لفظ استعمال کرنا صرف لفظی اشتراک کے سوا کچھ نہیں، اس حادثے کو فتنے سے تعبیر کرنا اس بات کی پختہ اور توانا دلیل نہیں کہ ابن سیرین نے جس فتنے کا تذکرہ کیا تھا اس سے مراد وہی ہے. کیونکہ تاریخ اسلامی میں بہت سارے حادثات اور خونریز جنگیں ہوئی ھیں، اور مؤرخین نے بھی ان جنگوں کو فتنوں سے تعبیر کیا ہے. لہذا شاخت کے ہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں جس کے بل بوتے پر کہہ سکے کہ ابن سیرین رحمہ اللہ نے جس فتنے کا تذکرہ کیا تھا، اس سے مراد (سنہ 126 ہجری) کا فتنہ ہی مراد ھے، بلکہ بہت سارے قرینے اس بات کی چغلی کرتے ہیں کہ فتنہ سے مراد شہادت عثمان غنی کے بعد پیدا ہونے والے فتنے مراد ہیں. سب سے بڑا قرینہ بلکہ ثبوت یہ ھے کہ خود ابن سیرین رحمہ اللہ کی تاریخ وفات 110ھ کے 16 سال بعد کا واقعہ ھے. آپ سے یہ بات منقول ہے: («ثَارَتِ الْفِتْنَةُ وَأَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ρ عَشَرَةُ آلَافٍ، لَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ أَرْبَعُونَ رَجُلًا»)[39].

فتنے بھڑک اٹھے، اور اصحاب رسول اللہ کی تعداد دس ہزار تھی، ان میں سے چالیس نے بھی اس فتنہ میں پڑنے کی جلدی نہیں کیں. یعنی چالیس صحابہ کرام بھی اس فتنہ میں شریک نہیں ہوئے.

اور امام ابن سیرین کا یہ بھی کہنا ہے (لقد قتل عثمان، وإن في الأرض عشرۃ آلاف من أصحاب رسول اللہ ρ)[40].

سیدنا عثمان رضي اللہ عنہ کو شہید کر دئے گئے، اور روئے زمین پر دس ہزار کے کی تعداد میں اصحاب رسول اللہ موجود تھے.

اب ابن سیرین کی ان دونوں تصریحات کو جمع کر کے تجزیہ کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جس فتنہ کا تذکرہ انہوں نے کیا تھا اس وقت صحابہ کی تعداد دس ہزار کے آس پاس تھی، تو کیا سنہ 126 ہجری میں صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی؟؟؟

ہر گز ایسا نھیں تھا، بلکہ اصحاب رسول اللہ ρ میں سے کوئی بھی باقی نہیں تھا، صحابہ کرام میں سے آخری صحابی حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلۃ اللیثی رضی اللہ عنہ تھے جو سنہ 110 ہجری میں وفات پا گئے[41].ہ

علامہ ہند ڈاکٹر محمد مصطفی الاعظمی رحمہ اللہ شاخت کی اس بیانیے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (کس دلیل کی بنیاد پر ابن سیرین کے اثر میں موجود فتنہ کو ولید بن یزید کے قتل کا فتنہ مراد لیا ہے؟؟

جب آدمی کسی بھی واقعہ میں حقائق کو دیوار پر مار کر اپنی خواہش کے مطابق تعیین کرنا ہی ہے تو اس فتنہ کو ہلاکو خان اور تاتاریوں کے فتنے سے تعبیر کریں، شاخت کسی بھی حادثہ کو اپنے خود ساختہ نظریے کے مطابق تشریح کرتے ہیں، اس میں تاریخی حقائق کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں یقینا (فتنے کی تشریح میں) شاخت کی رائے تاریخی حقائق کے یکسر متضاد ہیں.

اور شاخت کا ابن سیرین کے اس اثر کو بے بنیاد اور من گھڑت قرار دینا نا قابل تسلیم ہے، کیونکہ یہ اثر معتمد اسلامی مصادر میں آیا ہے، جس میں صحیح مسلم کا مقدمہ سر فہرست ہے، اور

آج تک ناقدین حدیث میں کسی نے اسے موضوع من گھڑت قرار نہیں دیا ہے، اور جب شاخت خود ابن سیرین کے اس اثر کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے ہیں تو مسلمانوں کی اسانید اور حوالوں کے اہتمام کو آغاز کو کسی فتنے سے جوڑنا چہ مقصد دارد؟

پروفیسر شاخت کے اس رائے کو انہی کے ہم منہج پروفیسر روبسون بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، روبسون لکھتے ہیں: "اسناد پر جو تنقید کی گئی ہے حقیقت میں یہ ایک گہری تنقید ہے، شاخت کئی تواناد لیل لے آئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسانید کا استعمال کچھ بعد میں ہوا ہے، لیکن انسان اس کی ہر بات کو قبول کرنے میں تردد محسوس کرتا ہے"[42].

جیمس روبسون ((James Robson) کی تشریح.

مستشرقین میں سے ابن سیرین کے اثر میں مذکور فتنہ کی تشریح کرنے والا دوسرا نام جیمس روبسون کا آتا جو اس فتنہ سے مراد سیدنا عبداللہ بن الزبیر کی حجاج بن یوسف الثقفي کے ساتھ ہونے والی جنگ لیتے ہیں، وہ اپنی اس تفسیر کی دلیل کے طور پر موطا امام مالک کا ایک اثر لیتے ہیں جن میں فتنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، امام مالک رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عمر رضي الله عنهما سے نقل کرتے ہیں (إنّه قال حين خرج إلى مكة معتمرا في الفتنة إن صُدِدْتُ عن البيت صنعنا كما صنعنا مع رسول اللهρ)[43].

جب عبداللہ بن عمر رضي الله عنهما فتنے کے ایام میں عمرۃ کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے دریں اثنا انہوں نے فرمایا: اگر مجھے بیت اللہ سے روکا گیا، تو ہم وہ کریں گے جو ہم نے نبیρ کے ساتھ (حدیبیہ کے سال) کیا تھا.

اور ابن عبدالبر نے تمہید میں سیدنا عبداللہ بن عمر کے وقت روانگی کی تاریخ لکھی ہے (**خرج ابن عمر رضي الله عنهما يريد الحج زمان نزل الحجاج بابن الزبير رضي الله عنهما**)[44].

سیدنا عبداللہ بن عمر اس وقت حج کے لئے نکلے جب حجاج نے ابن الزبیر کو گھیر رکھا تھا.

پروفیسر روبسون نے موطا کے اس اثر سے دلیل پکڑتے ہوئے اس فتنہ کو سیدنا ابن الزبیر اور حجاج بن یوسف کے درمیان ہونے والی جنگ مراد لیا جو کہ سنہ 72 ہجری میں ہوئی تھی، لیکن کیا اس کے اس نظریے کو قبول کیا جاسکتا ہے؟؟

عراق کے مشہور علم حدیث کے پروفیسر ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری لکھتے ہیں: "روبسون کی رائے اس فتنے کی تفسیر کے حوالے سے پروفیسر شاخت کی رائے سے معقول ہے، روبسون نے اسناد کی آغاز کو پروفیسر شاخت کی تاریخ سے نصف صدی پہلے قرار دیا، لیکن روبسون نے جس دلیل کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے وہ کوئی قطعی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر راس فتنہ کو ابن الزبیر اور حجاج کی جنگ قرار دیا جاسکے، کیونکہ ابن سیرین کے کلام اور مالک کی روایت میں لفظ فتنے کا اشتراک کوئی تواناد لیل نہیں بنتی کیونکہ فتنہ کا لفظ اسلامی تاریخ میں بہت ساری بغاوتوں مسلمانوں کی داخلی جنگوں کے لئے استعمال ہوا ہے[45].

اور نہ ابن سیرین کی تاریخ ولادت کی روشنی میں اس فتنے کی تفسیر ممکن ہے، کیونکہ ابن سیرین رحمہ اللہ نے اپنے زمانے سے پہلے زمانے کی بات کی ہے نہ کہ اپنے زمانے کی، کیونکہ انہوں نے اس اثر میں ضمیر غائب کا استعمال کیا ہے، اور کہیں بھی ضمیر متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کیا، ضمیر متکلم کو چھوڑ کر ضمیر غائب کا استعمال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے زمانے سے پہلے کسی حادثہ کا تذکرہ کر رہا ہے، اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ابن سیرین نے (**ماکانوا یسألون**) وہ لوگ اسناد کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، یہ تو سرے سے کہا ہی نہیں (**لم یکن الإسناد موجودا**) اسناد موجود نہیں تھا؟ اسے واضح ہوتا ہے کہ اسناد کا استعمال تو تھی لیکن اسناد میں موجو لوگوں کی حالت کے بارے میں چھان بین نہیں کرتے تھے، اور اسناد کے بیان کرنے اور نہ کرنے کا دارومدار بذات خود راوی پر منحصر ہوتا تھا وہ چاہے تو اپنے اسناد کا ذکر کرے اور اگر نہ چاہے تو اسکا تذکرہ نہ کردے[46]

امیر لیون کایٹانی 1926ء (Leone Caetani) اور سپرنجر 1893ء (Sprenger) کا اغاز اسناد کے حوالے سے اعتراض:

لیون کایٹانی آغاز اسناد کے حوالے سے لکھتے ہیں "سب سے پہلے حدیث کو جمع کرنے والا عروہ بن الزبیر (94 ہجري) اسناد کا استعمال نہیں کرتے تھے، اور اپنے کلام کا حوالہ قرآن مجید کے سوا کسی اور چیز کا نہیں دیتے تھے، جس طرح امام طبری نے ان سے جو اقتباسات نقل کیے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے"[47]

اسی لئے کایٹانی کا خیال ہے عبدالملک بن مروان کے زمانے تک –یعنی نبیρ کی وفات سے 60 سال تک احادیث رسول میں اسناد کا استعمال نہیں تھا، لہذا ان کی رائے میں اسناد عروہ بن الزبیر اور محمد بن اسحاق (151 ہجری) کے درمیان کے زمانے میں ہوا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتب ستہ میں موجود اکثر اسانید محدثین کا دوسری صدی ہجری میں بلکہ تیسری صدی ہجری کی گھڑی ہوئی پیداوار ہے[48].

اور شپرنجر لکھتے ہیں: (عروہ بن الزبیر کے عبدالملک بن مروان کی طرف لکھے ہوئے مراسلے اسناد سے خالی تھے، اسی لئے عروہ کی طرف نسبت کی جانے والی بات کہ وہ اسناد کا استعمال کرتے تھے، یقینا یہ نسبتا بعد والی چیز ہے.[49]

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری شپرنجر کی اس اقتباس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "شپرنجر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عروہ بن الزبیر کی اسانید بعد والوں کی خود ساختہ ہے، جسے (عروہ کی مرویات) پر چسپاں کیا گیا ہے[50].

کایٹانی اور شپرنجر کی اس رائے کو انہی کے ہم خیال مستشرق ہورو فنش نے ٹھکرا دی ہے، وہ لکھتے ہیں "وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ عروہ نے اسناد کا استعمال نہیں کیا تھا ان لوگوں نے عروہ بن الزبیر کے مراسلوں اور اس کی اسانید کی اچھی طرح تحقیق نہیں کی ہیں" ہورو فنش اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اسلوب کتابت میں واضح فرق ہوتا ہے جب کسی شخص کے سوال کا جواب لکھنا ہو تو اسلوب اور ہوتا ہے اور کسی علمی حلقوں کے لئے لکھنا ہو تو طرز کتابت کچھ اور ہوتا ہے، اور آخر میں ہورو فنش اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسناد کا آغاز پہلی صدی کے تیسری تہائی میں ہوئی ہے[51].

مستشرقین کے شبہات کے متعلق سب سے زیادہ جانکاری رکھنے والا علامہ مصطفی الاعظمی ان کے جواب میں لکھتے ہیں: (عروہ بن الزبیر کے اقتباسات صرف تاریخ الطبری میں ہی نہیں؛ حدیث کی بہت ساری کتابیں ان کے اقتباسات پر مشتمل ہیں، اور وہ تاریخ طبری سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں، کئی ایک اقتباسات میں جنہیں طبری نے عروہ کی طریق سے بیان کیا ہے، انہی اقتباسات کو (طبری سے پرانے) مصنفین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے نقل کیا ہے، میرے خیال میں عروہ بن الزبیر کے اقتباسات کے حوالے سے سب سے مشکل چیز خود عروہ کی کتاب کا موجود نہ ہونا ہے، اس کی کتاب میں سے میسّر مواد صرف اقتباسات ہی ہیں، اور یہ اقتباسات ہر اقتباس کرنے والے کے ہدف پر منحصر ہوتا ہے، یہ بات واضح ہے کہ ہر

زمانے میں محقق اور ریسرچ اسکالر اپنے سے پہلے والے لوگوں سے وہی اقتباس نقل کرتے ہیں جو ان کی ضرورت اور مدعا کے مطابق ہوں، اور عروہ بن الزبیر تابعی جلیل بہت پہلے زمانے کا ہے اور اس کی باتوں کا مصدر غالبًا صحابہ کرام ہی ہوتے تھے؛ جنہوں نے ان واقعات اور حادثات کا اپنی آنکھوں ہی سے مشاہدہ کیا تھا یا وہ صحابہ کرام جن کو ان واقعات سے دلچسپی ہوتی تھی، اسی لئے عروہ بن الزبیر اور نبی ρ کے مابین واسطہ صرف اور صرف ایک ہی شخص ہوتا تھا، اس لئے اسی ایک نام کو کسی بھی سبب کی بناء پر حذف کر دیتے تھے، اور یہ بھی خیال رہے کہ عروہ کی کتاب کو آگے نقل کرنے والے کئی راویاں تھے جن میں ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ ہیں جب ہم زہری کی روایت کی طرف دیکھتے ہیں تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں عروہ کبھی ایک سند کو ذکر کرتے ہیں، اور کبھی دوسندوں کو ذکر کرتے ہیں، اور یہ کایٹانی (**Caetani**) اور شپرنجر (**Sprenger**) کے اس دعوی کے سراسر خلاف دلیل ہے کہ عروہ اسناد کا استعمال نہیں کرتے تھے[52].

اور یہ بات توجہ طلب ہے کہ بعض کتابوں میں احادیث کے بغیر اسناد یا نامکمل اسناد سے ذکر ہونے کے کئی اسباب اور وجوہات ہوتے ہیں مثلاً کسی سائل کو فتوی دیتے ہوئے اس دلیل کی سند اختصارًا حذف کر دینا، یا راوی کو حدیث بعینہ انہی الفاظ میں ہونے پر شک ہو، یا بھول چوک کا شکار ہو، تو حدیث رسول میں انتہا درجے کی احتیاط برتتے ہوئے اسناد کو حذف کر دیتے ہیں، اور کبھی کبھی محدث ایک ہی سند سے کئی احادیث روایت کر رہا ہو، یا کسی حدیث کی سند شاگردوں کے ہاں مشہور اور معروف ہو تو حدیث کی سند کو حذف کر دیتے ہیں، حالانکہ ان احادیث کی اسانید محفوظ اور مکمل ہوتی ہیں، امام ابو یوسف القاضی رحمہ اللہ امام اوزاعی کو ایک علمی مراسلہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں (**لولا طول الکتاب لأسندتُ الحدیث لک**)[53].

اگر مراسلے کی طوالت کا خدشہ نہ ہوتا تو میں حدیث کی سند بھی بیان کرتا.

امام شافعی رحمہ اللہ اس بابت فرماتے ہیں: "ہر وہ حدیث جسے میں نے منقطعا (بغیر سند کے) کہی ہے اسے میں نے متصل سند کے ساتھ سنی ہے، اور جن سے یہ مرویات مشہور ہیں، انہی تک عام اہل علم (جنہیں علماء حدیث جانتے ہیں) کی وساطت سے سنی ہے لیکن مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں اس کتاب میں ایسی حدیثیں رکھوں جو مجھے ازبر یاد نہیں، اور میرے چند مکتوبات مجھ سے کھو گئے تو میں نے اپنے محفوظات کی اہل علم کے ہاں معروف احادیث کی روشنی میں جانچ پڑتال کی اور میں نے کتاب کو طوالت کے خدشہ سے مختصر کر دی.[54]

علماء حدیث اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ کسی حدیث کا کبھی مرسلًا ذکر ہونا، اور کبھی متصلًا ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اسناد مصنفین کی خود ساختہ ہے، راوی اور مصنفین کبھی بھول چوک کی وجہ سے اور کبھی اختصار کے لئے سند کو مکمل یا کچھ حصہ حذف کر دیتے ہیں، اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ سند میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی ہے، مثلاً سند میں کسی راوی کا اضافہ کرنا یا کسی راوی کی جگہ دوسرے راوی کا نام بدلنا وغیرہ، لیکن یہ دعوی کرنا کہ حدیث کے لئے سرے سے ایک سند گھڑ کر اس پر چسپاں کر دیا گیا ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے، امام شافعی رحمہ اللہ سعید بن المسیب کی مراسیل (جو ابن المسیب کسی صحابی کے حوالے کے بغیر بلا واسطہ رسول اللہ ρ سے بیان کرے) کو قابل حجت سمجھ کر بہت ساری فقہی مسائل میں ان سے استدلال کرتے ہیں، اور امام ابو حنیفہ اپنے اساتذہ کے مراسیل کو قابل حجت سمجھتے ہیں اور ان سے دلیل بھی لیتے ہیں، لیکن ان دونوں اماموں نے اور نہ ان کے متبعین نے ان مراسیل کے لئے سند گھڑی، اور یہ مراسیل جوں کے توں ان علماء کی کتابوں میں بغیر متصل سند کے موجود ہیں[55].

اگر کوئی منصف آدمی ابن ابی شیبہ (ت235ہجری) کی کتاب المصنف، اور عبد الرزاق صنعانی (211ہجری) کی کتاب المصنف اور بیہقی (458ہجری) کی مشہور کتاب السنن الکبیر کا مطالعہ کرے تو انہیں معلوم ہو گا کہ ان کتابوں میں بہت سی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار مرسلا-بغیر متصل سند کے- بیان ہوئے ہیں، اگر اسانید بنا کر چسپاں کرنا ہوتا تو ان کتابوں میں موجود احادیث پر صحیح اسانید چسپاں کی جاتیں، اور عبد الرزاق صنعانی اور ابن ابی شیبہ دونوں کتب ستہ کے مصنفین کے اساتذہ اور بعض کے اساتذہ کے اساتذہ ہیں.

مستشرقین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پہلے ایک نظریہ بنا لیتے ہیں پھر اپنے نظریہ کی تقویت کے لئے مثالیں ڈھونڈ لیتے ہیں، اور اپنے نظریے کو کمک پہچانے والی دلیل کے لیے صحیح ہونا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ اس کا وجود ہی کافی سمجھتے ہیں؛ اگرچہ وہ دلیل اصفہانی کی کتاب الاغانی میں ہی کیوں نہ ہو. ہاں اگر دلیل ان کے قائم کردہ نظریے کے برخلاف ہو تو بڑی ڈھٹائی سے اسے خود ساختہ قرار دیتے ہیں اگرچہ علماء اسلام کا اس دلیل کی صحت پر اتفاق ہی کیوں نہ ہو!!! جس طرح ابن سیرین کے اثر کے بارے میں شاخت کی رائے ہے.

خلاصہ

1. علم اسناد حدیث علوم اسلامیہ میں وہ امتیازی علم ہے جسے اللہ تعالی نے محمد ρ کی امت کو نوازا، اور اسی کے ذریعے حدیث رسول ρ کی حفاظت کی.
2. لغوی اعتبار سے اسناد: اعتبار، بلند کرنا، اور حوالہ دینے کے معنی میں آتا ہے، اور محدثین کے اصطلاح میں راویوں کے اس سلسلہ کو کہا جاتا ہے جو متن تک پہنچتا ہے.
3. اسناد وہ پل ہے جس کی وساطت سے قرآن اور حدیث ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا.
4. حدیث نقل کرنے میں چھان پھٹک، اور قبول کرنے میں احتیاط کبار صحابہ کے دور میں ہوا، لیکن یہ عام نہیں تھا، بلکہ بعض حالات کے تقاضوں کے مطابق گواہی طلب کیا جاتا تھا.
5. شہادت عثمان ت کے بعد اسلامی ریاست میں فتنے بھڑک اٹھے، تب حدیث بیان کرنے والوں کا نام اور ان کی اعتقادی حالت پوچھنے لگے.
6. سنہ 60 ہجری کے آس پاس نبی ρ کی طرف گھڑی ہوئی باتیں منسوب کرنے لگے؛ تو حدیث کو بغیر سند کے قبول کرنا چھوڑ دیا.
7. مستشرقین آغاز اسناد کو دوسری صدی میں ثابت کرنے کے لئے امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے ایک اثر کا سہارا لیتے ہیں، جس میں لفظ فتنے کا تذکرہ ہوا ہے اور فتنے کی تشریح خلافت بنی امویہ کی آخری شورش سے کرتے ہیں، تاکہ اسناد کو دوسری صدی کا پیداوار قرار دیا جائے.
8. خود امام ابن سیرین نے اس فتنے کو شہادت عثمان کے بعد پیدا ہونے والی شورش سے تعبیر کیا ہے، اور اسی طرح ان کے ہم عصر حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی اس فتنہ کو شہادت عثمان ت کا فتنہ قرار دیا ہے.
9. خود مستشرقین اس فتنے کی تفسیر اور تعیین میں متفق نہیں، متاخر مستشرقین اپنے پیش رووں کا قول نقل کرنے کے بعد ان کی تعبیر کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں.

حوالہ جات

(1). Lecturesom Arabic Historians 1930Historians P: 20

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

(2)ابن حجر: احمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (852ھ-)، الإصابة، تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود, دار الكتب العلمية,1415ھ- (216/5).

(3)ابن منظور: محمد بن مكرم بن على الأنصاري الإفريقى، (ت 711ھ-)، لسان العرب، دار صادر بيروت، 1414ھ، (2114/4) مادة: "سند".

(4)ابن حجر: احمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی (852ھ-)، نزهة النظر، تحقيق نور الدين عتر، مطبع الصباح دمشق 2000م (ص46).

(5)ابن جماعة: محمد بن إبراهيم بن سعد الله بن جماعة، المنهل الروي في مختصر علوم الحديث النبوي، تحقيق: محی الدين عبد الرحمن رمضان، دار الفكر دمشق، 1406ھ، (ص30).

(6)ابن تيمية: أحمد بن عبد الحليم بن تيمية الحراني (ت: 728ھ-)، مجموع الفتاوى، تحقيق: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف، المدينة النبوية، المملكة العربية السعودية، 1995م، (9/1).

(7) ابن رجب الحنبلي: عبد الرحمن بن أحمد بن رجب بن الحسن، البغدادي (ت: 795ھ)، شرح علل الترمذي، تحقيق همام عبد الرحمن سعيد، مكتبة المنار - الزرقاء - الأردن 1987م، (360/1).

(8)ملا علي القاری: علي بن سلطان محمد، أبو الحسن نور الدين الهروي (ت 1014ھ-)، مرقاة المفاتيح، دار الفكر، بيروت - لبنان 2002م، (448/1).

(9)مسلم: مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261ھ-): مقدمة صحيح مسلم، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي - بيروت (15/1).

(10)مسلم: مقدمة صحيح مسلم (15/1).

(11) ابن عبد البر: يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي (ت: 463ھ-) التمهيد، تحقيق: مصطفى بن أحمد العلوي، محمد عبد الكبير البكري، وزارة عموم الأوقاف والشؤون الإسلامية - المغرب، 1387ھ (57/1).

(12)الخطيب: أحمد بن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي الخطيب البغدادي (المتوفى: 463ھ-) الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، تحقيق: د. محمود الطحان، مكتبة المعارف - الرياض الجامع (102/2).

(13)الخطيب: الجامع (212/2).

(14) أحمد: أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (ت: 241ھ-)، المسند، تحقيق: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، مؤسسة الرسالة 2001م (101/42) (حديث نمبر 25183).

(15) أحمد: المسند (حديث نمبر 18493).

(16)الحاكم: محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه النيسابوري (ت: 405ھ-) المستدرك، تحقيق: يوسف المرعشلي، دار المعرفة بيروت لبنان (1/ 127).

(17)الطحاوي: أحمد بن محمد بن سلامة الأزدي الطحاوي (ت: 321ھ-)، أحكام القرآن، تحقيق: الدكتور سعد الدين أونال، مركز البحوث الإسلامية التابع لوقف الديانة التركي، استانبول 1995م (224/223/1).

(18)ابن سعد: محمد بن سعد بن منيع الهاشمي (المتوفى: 230ھ-) الطبقات الكبرى، تحقيق: محمد عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية - بيروت 1990م (21/7).

(19)الفسوي: يعقوب بن سفيان بن جوان الفارسي الفسوي، (ت: 277ھ-) المعرفة والتاريخ، تحقيق: أكرم ضياء العمری، مؤسسة الرسالة، بيروت 1981م (633/2).

(20)الذهبي: محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز الذهبي (ت: 748ھ-) تذكرة الحفاظ، دار الكتب العلمية بيروت - لبنان 1998م (6/1).

(21)مالک: مالك بن أنس الأصبحي إمام دار الهجرة، (179ھ-) الموطأ - رواية محمد بن الحسن، تحقيق: تقي الدين الندوی، دار القلم دمشق 1991م (3/ 99) رقم حديث (722).

(22) البخاري: محمد بن إسماعيل أبو عبد الله البخاري الجعفي (256ھ-) صحيح البخاري، تحقيق: محمد زهير بن ناصر الناصر، دار طوق النجاة، 1422ھ، (8/ 54) حديث نمبر (6245)، مسلم: صحيح مسلم، (3/ 1694) حديث نمبر (2153).

(23) أبو داود: سليمان بن الأشعث بن إسحاق السِّجِسْتاني (ت: 275ھ-) السنن، شعَيب الأرنؤوط - محَمَّد كامِل قره بللي، دار الرسالة العالمية، 2009م (2/ 630) (حديث نمبر 1521).

(24)مسلم: مقدمة صحيح مسلم (15/1).

(25)القرطبي: أحمد بن عمر بن إبراهيم، (ت 656) المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم، تحقيق: محيي الدين ديب ميستو، دار ابن كثير دمشق 1996م (1/211-223).

(26)ابن تيمية: منهاج السنة النبوية، تحقيق: محمد رشاد سالم، جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية 1986م (132/6).

(27)ابن الأثير: محمد بن محمد بن عبد الكريم الجزري (630ھ)، تحقيق: عمر عبد السلام تدمري، دار الكتاب العربي، بيروت - لبنان 1997م (ت: 630ھ-)، الكامل (661/1).

(28)حرب: حرب بن اسماعيل بن خلف الكرماني (ت 280ھ)، مسائل حرب الكرماني إعداد: فايز بن أحمد بن حامد حابس جامعة أم القرى 1422ھ (۳/۱۳۴۱-۷).

(29)ابن الأثير: الكامل (70/1).

(30)العمري: أكرم ضياء، بحوث في تاريخ السنة المشرفة، مكتبة العلوم والحكم، المدين المنورة (ص25-35).

(31)معمر: معمر بن راشد الأزدي (ت: 153ھ-)، الجامع، تحقيق: حبيب الرحمن الاعظمی، المجلس العلمي بباكستان، بيروت 1403 (ت: 153ھ-) (11/ 357) (حديث نمبر ۲۰۷۰۲۵۳).

(32) الخزاعي: نعيم بن حماد: نعيم بن حماد بن معاوية بن الحارث الخزاعي المروزي (ت: 228ھ-) الفتن، تحقيق: سمير أمين الزهيري، مكتبة التوحيد القاهرة 1412ھ (1/ 184) حديث نمبر (487).

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

(33)الخزاعي: نعيم بن حماد، الفتن(1/184).

(34) سورة الزمر:31.

(35)القرطبي: المفهم،(1/321).

(36)ابن تيمية: منهاج السنة النبوية(1/755).

(37) Schacht Origins page: 36، 37

بحوالہ دراسات فی الحديث النبوي(۲/۵۹۳-۵۹۲)

(38)الطبري: محمد بن جرير بن يزيد الطبری،(ت:310ہجري) تاريخ الرسل والملوک، دار التراث بيروت 1387ہجری،(4/252)حوادث(سنة126).

(39)معمر: معمر بن راشد الازدي البصري، الجامع، تحقيق: حبيب الرحمن الاعظمي، المجلس العلمي بپاکستان، ط1403ہجری،(جامع معمر بن راشد(11/357)(حديث نمبر20735).

(40) ابن شبہ: عمر بن شبة بن عبيدة بن ريطة النميري البصري، ابوزيد(ت:262ھ-) تاريخ المدينہ، فہيم محمد شلتوت ط/1399ہجری،(4/ 1271).

(41)دیکھیے: ابن حجر: احمد بن علی بن حجر العسقلاني(ت852ھ)الإصابة في تمييز الصحابة، تحقيق: عادل احمد، وعلی محمد معوض، دار الکتب العلمية، بيروت 1415ہجري(1/ 84).

(42) Robson، op. cit. 21

بحوالہ: الاعظمی، دراسات في الحديث(2/394).

(43) مالک: الموطا(حديث نمبر99).

(44) ابن عبد البر: يوسف بن عبد الله بن عبد البر النمري، التمهيد لما في الموطا من المعاني والاسانيد، تحقيق: مصطفى بن احمد العلوي، محمد عبد الكبير البكري، ط/ وزارة عموم الاوقاف والشؤون الإسلامية–المغرب(15/202).

(45) العمري: ڈاکٹر اکرم ضياء العمری، بحوث في تاريخ السنہ المشرفہ، مکتبہ العلوم والحکم، المدينہ المنورہ،(ص51).

(46)الاعظمی، الدکتور محمد مصطفی،(ت:1439ھ-) دراسات في الحديث النبوی وتاريخ تدوينہ، المکتب الإسلامی بيروت1992م.(2/396-397).

(47) J. Robson، The Isnad in Muslim Traditions، The Isnad in Muslim Traditions، Glasgow Unof Oriental Society Transaction، Annali dell Islam quiting 18 vol. p.

بحوالہ: الاعظمي: دراسات في الحديث النبوي(2/392)

(48)دیکھئے: الاعظمی، الدکتور محمد مصطفی، دراسات في الحديث النبوی.(2/392).

(49) J Robson The Isnad in Mislim Traditions P. 18

بحوالہ الاعظمي: دراسات(2/392).

(50)العمري: موقف المستشرقين(72-73).

(51)دیکھیے: الاعظمی: دراسات(2/393).

(52) دیکھیے: الاعظمی: دراسات(2/393).

(53) ابويوسف: يعقوب بن إبراهيم بن حبيب الانصاری القاضی(ت:182ھ-)، الرد علی سير الاوزاعی، تحقيق: ابو الوفاء الافغانی، لجنة إحياء المعارف النعمانية حيدر آباد دکن، ہندوستان(ص 31).

(54) الشافعی: محمد بن إدريس المطلبی(ت: 204ھ-)، القرشي الرسالة، تحقيق: احمد شاکر، مکتبہ الحلبي، مصر1940م(1/ 431).

(55) العمري: ڈاکٹر اکرم ضياء العمری، بحوث في تاريخ السنہ المشرفہ (ص57-58).